خطبۂ صدارت

ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس مرادآباد

منعقدہ

۱۴، ۱۵ جون ۱۹۶۹ء

از

مولانا سید ابوالحسن ندوی

شائع کردہ

مجلس استقبالیہ ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس (مرادآباد)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرات!

ہماری پہلی دینی تعلیمی کانفرس بستی میں ۳۰/۳۱ دسمبر ۱۹۵۹ء اور یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو ہوئی اس موقع پر نہ صرف یہ کہ عصر حاضر کے تقویم کے دو سال گلے مل رہے تھے، اور سال کہن سال نو کو اپنی ذمہ داریاں، اور غیر مختتم کاموں کی امانت سپرد کر رہا تھا، بلکہ ہندستان کی ملت اسلامیہ کے اکثر و بیشتر اہل درد و اصحاب فکر ملت کے درد، اور تلخ کامی کے احساس کے ساتھ مشورہ اور تبادلۂ خیال میں مصروف، اور ملت کی حفاظت و خدمت کے لئے شیر و شکر اور ایک جان دو قالب ہو رہے تھے، اسی مبارک اجتماع سے "دینی تعلیمی کونسل" اتر پردیش کا وجود عمل میں آیا، اور ایک منزل کے مختلف اور متفرق مسافر، نیا قافلہ بنا کر، نئے عزم و حوصلہ، نئی صدائے جرس، اور نئے بانگ درا کے ساتھ منزل کی طرف رواں ہوئے، اس قافلہ کے مسافروں کا شعر دیر سے عقیدہ، اور اصول تھا، کہ

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

مطبوعہ
تنویر پریس
امین آباد۔ لکھنؤ

حضرات!

ہندستان کی ملت اسلامی نے بارہا وسیع عالم اسلام کی دستگیری اور چارہ سازی کی ہے، اس نے متعدد بار ملت اسلامی کے خستہ و شکستہ جسم کو نیا خون اور نئی توانائی، اس کے تھکے ہوئے دماغ کو تازگی و شادابی، اور اس کے علم و فن کے چراغ کو نیا تیل نئی روائتی تابانی اور درخشانی عطا کی ہے، اس نے اس کے لئے کئی بار نئے علمی اجتہاد، اور نئی دینی تجدید کے دروازے کھولے ہیں، اس نے صرف دین و شریعت ہی نہیں، جس میں سب کا برابر کا حصہ ہے، بلکہ عربی زبان و ادب کو بھی چار چاند لگائے ہیں اور عجمی نژاد ہونے کے باوجود اس نے عربی لغت میں بھی عربوں کی رہنمائی و استادی کا فرض انجام دیا ہے، وہ تاتاریوں کے وحشیانہ حملوں کے پر آشوب دور میں عالم اسلام کی واحد پناہ گاہ، اہل کمال کا ملجا و ماوٰی رہی ہے، اس نے اپنے دور میں بغداد و قرطبہ، اور شیراز و یمن کی ہمسری کی ہے، اس کی اسلامی غیرت، دینی حمیت، اخلاقی استقامت، ثبات و استقلال، جرأت و جانبازی، ایثار و فیاضی، اور عشق رسول کے چرچے تاریخ کے صیغوں مدرسہ و خانقاہ کے حجروں اور مکہ مدینہ کی گلیوں میں رہے ہیں، اس کے اساتذہ کبار اور علمائے نامدار کی طرف رجوع، جامعہ ازہر کے علما کا شعار، اور طلبہ کا سرمایۂ افتخار رہا ہے۔ اس کے باکمال اور صاحب ایثار علماء و وزرا کی تعریف کے نغمے اور دعا کے زمزمے صدائے لبیک کی طرح مکہ کے کوچہ و بازار میں گونجے ہیں[1] اس کی آنکھ

---

[1] یہاں پر جو اشارات کئے گئے ہیں ان کی تفصیل ہندستان کی اسلامی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہے اجمال کے لئے راقم کی کتاب "ہندستانی مسلمان" کا مطالعہ کافی ہوگا۔

عالم اسلام کے حادثہ پر خون کے آنسو روتی اور یہ ملت عالم اسلام کے ہر کنبہ و گھرانہ کی حفاظت کے لئے جسم و جاں نچھاور کرتی رہی ہے، اس سے نہ صرف ماضی کی عظمت پیوستہ تاریخ کی آبرو قائم، بلکہ مستقبل کی بھی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، اقبالؒ نے نصف صدی پیشتر ہندی ملت اسلامیہ کے ذہنی تفوق کا اعلان جس انداز میں کیا تھا، اس کو محض شاعرانہ مبالغہ اور نسلی تعصب پر محمول نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی صداقت بارہا آشکار ہوئی، ع

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی ذہن ہندی، نطق اعرابی

یہ ملت پہلی مرتبہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے وقت ایک ایسے امتحان سے دوچار ہوئی جس میں اس کی جرأت اور قوت فیصلہ کا بھی امتحان تھا، اور اس کی ذہانت اور زندگی کی صلاحیت کا بھی، وہ یہ کہ کیا یہ ملت نامساعد، بلکہ مخالف حالات کے اندر حاکمانہ وسائل و مواقع سے محروم رہتے ہوئے اور حکومت کی بے تعلقی و غیر جانبداری ہی نہیں بلکہ ایک حد تک بدگمانی اور مخالفت کے ساتھ بھی اپنے ملی وجود کو قائم، اپنی اجتماعی شخصیت کو (جو کسی ملت اور ہم عقیدہ گروہ کے لئے وہی حیثیت و اہمیت رکھتی ہے جو ایک فرد کے لئے ان کی انفرادی شخصیت)، برقرار اور اپنی دینی و ذہنی معاشرتی و تہذیبی خصوصیات، اپنے لسانی اور ثقافتی سرمایہ، اور اپنے علمی دینی تعلیمی اداروں کو محفوظ اور زندہ رکھ سکتی ہے؟

یہ ایک نہایت جلی و روشن، اور طویل و عریض علامت استفہام تھی، جو انیسویں صدی کے انقلاب ہندستان کے مورخ نے، جو قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ سے

آشنا، اور ملل و اقوام کی اندرونی صلاحیتوں، اور باطنی سرچشموں سے واقف تھا، اور جس نے ملت اسلامیہ کی ایک ہی صلاحیت کا اس وقت تک تجربہ کیا تھا، کہ وہ حاکمانہ اقتدار، اور معتدل و موافق حالات میں اپنے شعار و شریعت، اور اپنی زبان و ثقافت کی کامیابی کے ساتھ حفاظت، اور اس میں اضافہ و ترقی کرتی ہے، ہندی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ورق الٹتے ہوئے، نئے صفحہ پر ایک ایسے انداز سے ثبت کی جس میں شک و شبہ، تذبذب و تردد زیادہ تھا، اور اعتماد و اطمینان کم، مسلمان مورخین کا قلم جن کا اس ملت کے ساتھ محض علمی و عقلی نہیں، بلکہ قلبی و جذباتی تعلق بھی تھا، اس موقعہ پر لغزش و لرزش سے محفوظ نہ رہ سکا، انھوں نے ڈرتے ہوئے دل، اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے یہ سوالیہ نشان تاریخ کے صفحات پر ثبت کیا، اس اضطرابی کیفیت کو آپ شہر آشوب کی نظموں، ملی مرثیوں کے اشعار سے لے کر مسدس حالی کے صفحات تک دیکھ سکتے ہیں، یہ پہلا تجربہ تھا جو عالم اسلام کے وسیع رقبہ میں ہندستان کی سرزمین پر ہونے جارہا تھا عالم اسلام کے کسی گوشہ میں اس وقت تک مسلمان اقتدار و بالادستی سے اس طرح یکسر محروم، اور ایک نئی تہذیب، اور ایک نئے تعلیمی نظام سے اچانک اس طرح آشنا نہیں ہوئے تھے، جس طرح ہندستان کے مسلمان، اور نہ کہیں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد یکجا آباد، اور نہ اتنی سیاسی و لسانی مذہبی و تہذیبی پیچیدگیوں، اور مشکلات سے دوچار تھی، جتنی یہاں، کسی ملت کی ذہانت و صلاحیت کا اتنا بڑا امتحان مشکل سے پیش آیا ہوگا، جیسا ہندی مسلمانوں کو اس دور میں پیش آیا،

۱۸۵۷ء کے بعد کے چند سال حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے، اپنے

حواس کو یکجا کرنے، اور فاتح قوم کی اس ہیبت و رعب کے دور کرنے میں صرف ہوئے جو ہمیشہ ایسے انقلاب سلطنت کے وقت بڑی سے بڑی مفتوح قوم کو پیش آیا کرتے ہیں، یہی وہ دور تھا جس میں فرنگیوں کے مافوق الفطرت ہونے کا خیال، مستقبل سے یکسر مایوسی، اور حالات کے سامنے سپر اندازی کی تلقین ہم کو ہندستانی مسلمانوں کے شعر و ادب، اور تصنیف و تالیف میں نظر آتی ہے، لیکن بہت جلد اس ملت کے رہنما اور قائدین نے جن میں بڑی تعداد علماء، و اہل قلوب کی تھی، یہ فیصلہ کیا کہ ان کو تاریخ کے اس چیلنج کو قبول کرنا ہے، اور اس ملک میں اپنے عزم و یقین، اپنے جذبہ ایثار، اپنے نظم و اتحاد، اپنی ذاتی قربانیوں اور اپنی فہم جوئی اور اولوالعزمی سے اپنے ملی وجود اور اجتماعی شخصیت کو، اپنی تہذیبی و معاشرتی خصوصیات کو، اپنی زبان و ادب کے سرمایہ کو، اپنے علمی و دینی اداروں کو، نہ صرف محفوظ، بلکہ پھلتا پھولتا رکھنا ہے۔ آپ ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے ان مہیب اور تیرہ و تار سالوں اور مہینوں کا تصور کیجئے، جب کسی ادنیٰ اسلامی شعار کے وجود، اور کسی غدر کی تہمت پر لوگوں کو درختوں پر چڑھا کر پھانسیاں دے دی جاتی تھیں، لاکھوں کی جائدادیں ضبط کر کے گلزار محلوں اور پر شور محلوں پر ہل چلوا دئے جاتے تھے، کروڑوں کے اوقاف جن سے مدارس اور خانقاہوں کو زندگی نصیب تھی، ضبط ہو گئے تھے۔ عیسائیت کی علمی تنقید اور اسلام کے دفاع کے جرم میں لوگوں کو ترک وطن کر کے بلاد عربیہ میں پناہ لینی پڑتی تھی، ملازمتوں کے دروازے تعلیم یافتہ مسلمانوں پر اس طرح بند کر دئے گئے تھے، اور ان کو اس طرح بے روزگاری، فاقہ کشی اور دریوزہ گری پر مجبور کیا گیا تھا، مسلمانوں کے ساتھ ہر شعبہ زندگی میں ایسا امتیازی سلوک کیا جاتا تھا

اور ان کو تدریجی طور پر ایسا مفلوج بنایا جا رہا تھا اور ایک ذلیل قوم میں ایسا تبدیل کیا جا رہا تھا، کہ خود انگریز اہل ضمیر اور اہل قلم اس پر خاموش نہ رہ سکے، اور ہندستانی مسلمانوں کے ایک شدید معاند ڈاکٹر سر ولیم ہنٹر نے بھی اس صورت حال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اس زمانہ میں جب بیک وقت شدید سیاسی ذہنی اور معاشی بحران سے مسلمان دوچار تھے، اور بظاہر یہ ملت ایک جانکنی کی حالت میں مبتلا تھی، ملت کے قائدین کا یہ فیصلہ کہ وہ اس ملک میں جہاں بہتری کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے، اور جب ان پر زندگی کے سب دروازے بند ہو رہے تھے وہ اپنے ملی وجود ہی کو نہیں، بلکہ اپنی زبان وثقافت، اور اداروں کو بھی محفوظ رکھیں گے، کتنا عظیم فیصلہ تھا اور وہ ان سے کس درجہ کی جرأت، اور کس درجہ کی ذہانت کا طالب تھا، یقیناً وہ ان نتائج سے بے خبر نہ تھے، جو ان کو اس کام کی تکمیل میں پیش آنے والے تھے، انھوں نے اپنی سلامتی اپنی خوشحالی، اپنی اولاد کے مستقبل، اور اپنی ملت کی دنیاوی سربلندی، ہر چیز کو داؤں پر لگا دیا تھا، اسی مقدس گروہ کے مقتدر رکن مفتی صدر الدین خاں آزردہ نے جنھوں نے آفت رسیدہ اور خزاں دیدہ دہلی میں محض اپنی ذات سے نصف صدی تک علوم اسلامیہ کی شمع روشن رکھی، اس عزم وفیصلہ کو جس خوبی سے بیان کیا ہے، اس نے اس شعر کو اردو کے منتخب ترین اور چیدہ ترین اشعار میں جگہ پانے کا مستحق بنا دیا ہے، میں اس کو محض غزل کا ایک عمدہ شعر ماننے کے لئے تیار نہیں، وہ ملت اسلامیہ کے ان مبارک قائدین کے ایک عہد ومیثاق، اور اس دور کے مسلمانوں کے لئے منشور زندگی کی حیثیت رکھتا ہے، وہ فرماتے ہیں: ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

ملت ہندی کے صاحب نظر، اور صاحب دل رہنما کفن بر دوش میدان میں آ گئے اور عشق کا یہ سودا شروع کیا، اور باد صرصر کے ان تیز و تند جھونکوں میں انھوں نے نہ صرف دینی تعلیم، اسلامی شخصیت کی تعمیر اور اسلامی دل و دماغ کی تشکیل کی شمع روشن کی، بلکہ ان علوم اسلامیہ کے چراغ بھی جا بجا جلائے، مفلس کے چراغ کی طرح مغلوں کے دور آخر میں جو ملت اسلامیہ کے سیاسی عروج واقبال تمام ہی سے بجھے بجھے سے نظر آ رہے تھے اور جن کے روغن وفتیلہ کا سرمایہ داتا نہ عرصہ سے ختم ہو رہا تھا انھوں نے نہ صرف پرانے چراغ روشن رکھے، بلکہ نئے چراغ بھی جلائے ان کے جلائے ہوئے بعض نئے چراغ، حق یہ ہے کہ اپنی تابانی و درخشانی اور ضیاء افشانی و نور افشانی میں ان پرانے چراغوں سے بھی بڑھ گئے، جن کے روغن وفتیلہ کا اہتمام شاہان مغلیہ، وزرائے سلطنت، اور امرائے نامدار نے اپنے ذمہ لیا تھا، اور جن کے لئے پورے پورے مواضعات، اور بیسیوں گاؤں وقف تھے، اسی دور میں مدرسہ عربیہ دیوبند جو بعد میں دار العلوم ۔ دیوبند کے نام سے شہرہ آفاق ہوا، قائم ہوا، جس کی مثال (اپنی وسعت وآفاقیت، طلبہ وفضلاء کی کثرت میں) مسلمانوں کے دور سلطنت، اور اس کے عہد عروج واقبال میں بھی نہیں ملتی، درس نظامی کی بنیاد اگرچہ ملا نظام الدین کے مضبوط ومقبول ہاتھوں سے ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے پڑ چکی تھی لیکن ان کا یہ نظام شمسی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد بھی نئے نئے سیارے عطا کرتا رہا اور فرنگی محل کی ٹکسال برابر نئے نئے سکے ڈھالتی اور علم وفن کی قلمرو میں ان کو جاری کرتی رہی، فخر المتاخرین مولانا عبد الحئی فرنگی محلی کا حلقہ درس جس میں

ڈھاکہ اور چاٹ گام سے لے کر ہرات و بخارا تک کے علماء و فضلاء ہوتے تھے، اسی دور کی یادگار ہے، سہارن پور کا مدرسہ مظاہر العلوم، غازی پور کا چشمہ رحمت جون پور کا مدرسہ حنفیہ، پھر آخر میں لکھنؤ کا دار العلوم ندوۃ العلماء جس نے ایک بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی، اسی دور کے علماء کی اولوالعزمی، اور اسی عہد کے مسلمانوں کے دینی جذبہ کی یادگار ہے،

نہ صرف مدارس کی شکل میں، بلکہ باکمال شخصیتوں کے قالب میں بھی، مردم خیزی اور آدم گری کے میدان میں بھی، جو کسی ملت کی اہلیت و صلاحیت، اور استحقاق زندگی کی واضح ترین علامت اور بہترین ضمانت ہے، اس ملت نے اپنے تفوق کا اظہار کیا، اسی دور میں علوم اسلامیہ کے دائرہ میں اور اصلاح وجدوجہد کے میدان میں مولانا محمود حسن دیوبندی جن کو بالآخر عرب وعجم نے شیخ الہند کے نام سے یاد کیا، جیسی صاحب عزم شخصیت، مولانا اشرف علی تھانوی جیسا فصیح و مصلح مولانا انور شاہ جیسا محدث و عالم، مولانا سید حسین احمد مدنی جیسا مجاہد و شیخ مولانا محمد الیاس کاندھلوی جیسا داعی الی اللہ اور صاحب یقین، مولانا شبلی جیسا مورخ و نقاد، مولانا سید سلیمان ندوی جیسا سیرت نگار و متکلم، مولانا محمود حسن خاں ٹونکی جیسا مصنف و مورخ، مولانا سید مناظر احسن گیلانی جیسا رواں قلم اور شاداب رقم پیدا ہوا، اسی دور میں دینی علوم سے لے کر تاریخی و ادبی موضوعات پر، اور عربی سے لے کر اردو تک متعدد ایسی تصنیفات ہندی علماء کے قلم سے نکلیں جو یگانہ و منفرد حیثیت رکھتی تھیں، اور جن کا ترجمہ دوسری اسلامی زبانوں میں ضروری سمجھا گیا ۔

اسی ۱۸۷۵ء کے بعد علی گڑھ مدرسۃ العلوم کی بنیاد پڑی جس نے بعد میں مسلم یونیورسٹی کے نام سے عالمگیر شہرت حاصل کی، یہ اس عہد کے مسلمانوں کی قوت ارادی، صلاحیت کار، اور ذہانت کا ایک درخشاں نمونہ ہے، ان تمام پہلوؤں کے ساتھ جن سے کسی صاحب نظر کو اختلاف ہو سکتا ہے اور جن میں قدرتی طور پر تنقید کی گنجائش ہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی ملک کے مسلمانوں نے ایسے نازک حالات میں مسلم یونیورسٹی جیسا تعلیمی اور فکری مرکز قائم کر کے اپنی قوت عمل، اپنی بلند نگاہی، اور اپنی ذہانت کا ایسا ثبوت پیش نہیں کیا، جیسا کہ پامال و شکستہ حال ہندی مسلمانوں نے عین ۱۸۵۷ء کے ہمہ گیر انقلاب کے بعد کیا، یہ درس گاہ مسلمانوں کے لئے صرف ایک تعلیمی مرکز کی حیثیت نہیں رکھتی تھی، بلکہ ان کی آرزوؤں کا نشیمن، ان کی امنگوں کی جولاں گاہ، ان کے شاہین اور عقاب صفت نوجوانوں کی ذہانتوں اور حوصلہ مندیوں کی بازی گاہ اور ان کے فرزانہ اور دیرینہ سال صاحب تمکنت و باوقار قائدین کا مرکز رہا ہے، جنھوں نے یہاں سے بیٹھ کر نہ صرف ملت کی تعلیمی سربراہی، بلکہ سیاسی رہنمائی بھی کی ہے، پھر بالآخر محمد علی جیسے درویش سیرت، قلندر صفت رہنما نے ثابت کر دیا کہ ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

پھر اسی نسل میں اقبال جیسا شاعر و مفکر، حسرت و جگر جیسے غزل گو، ظفر علی خاں جیسا ذہین و قادر الکلام، ابو الکلام جیسا جادو بیان و سحر طراز، عطاء اللہ شاہ بخاری اور بہادر یار جنگ جیسے خطیب و شیوہ بیان، اور کتنے ایسے اہل کمال پیدا

ہوئے جن کی نظر اس عہد میں دوسرے اسلامی ملکوں میں ملنی مشکل ہے!

حاصل کلام یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندستان کی ملت اسلامی نے نہ صرف اپنی زندگی کا تسلسل قائم رکھا، بلکہ اپنی توانائی، اور نمود شادابی کا بھی ثبوت دیا، اس نے نہ صرف زندگی کا استحقاق ثابت کیا بلکہ یگانہ و بیگانہ کو اپنی عظمت کے اعتراف، اور اپنی ذات کے اقرار پر بھی مجبور کیا، اس کے اہل قلوب نے اپنی ہی نہیں بلکہ دوسروں کے دلوں کی انگیٹھیوں کو بھی گرم رکھا اس کے اہل دماغ نے اپنے ہی بچوں کے دماغوں کو نہیں ملت کے فرزندوں کے دماغوں کو بھی روشن کیا، اس کے اہل ثروت نے اپنے ہی گھروں کے چولھے اور چراغوں کو روشن نہیں کیا، بلکہ مکتبوں اور مدرسوں، اور قومی تعلیم کے اداروں کی زندگی و تابندگی کو، اپنی امنگوں کی تکمیل، اپنی تفریحات کی رونق اور اپنی تقریبات کی شان و شوکت پر مقدم رکھا، مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے لے کر مدرسہ عربیہ دیوبند تک، اور خلیج بنگال سے لے کر وادی کشمیر تک ہر جگہ آپ کو اس طبقہ کی علم پروری، حق پرستی، اور اولو العزمی و دریا دلی کی مثالیں ملیں گی، اسی دور میں ہر صوبہ کے مسلمانوں نے تعلیمی انجمنیں قائم کیں، جن میں غیر منقسم ہندستان کی انجمن حمایت اسلام، لاہور، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ اور ندوۃ العلماء، لکھنؤ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، وسیع یا محدود اندازوں کے مطابق ایک اہم اسلامی خدمت سمجھ کر تقریباً ہر بڑے شہر میں اسلامیہ اسکول، اور اسلامیہ کالج قائم کئے اور کہیں کہیں مسلم ہوسٹلوں کی بنیاد بھی ڈالی، بہت سے جوانوں نے اور بہت سے سن رسیدہ بزرگوں نے اپنی عمر میں ان اداروں کی خدمت اور گھر گھر تعلیمی پیغام پہونچانے کے لئے نذر کیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ اسی دور کی یادگار ہے،

جس کے لائق اساتذہ کا ایثار، اور نوجوان کارکنوں کی قربانیاں آسانی سے بھلائی نہیں جا سکتیں، انجمن ترقی اردو، دہلی دار المصنفین، اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین، دہلی دار الترجمہ اور دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، یہ سب اس عہد کے مسلمانوں کے علمی شغف، تنظیمی صلاحیت، اور علمی جد و جہد کے نمونے ہیں، جن کا تذکرہ کرنے میں ہم نے بہت اختصار اور انتخاب سے کام لیا ہے،

اس دینی و تعلیمی جد و جہد کے ساتھ مسلمانوں نے اپنا اوپر زیادہ حق سمجھ کر ہندستان کی آزادی کی جد و جہد میں اپنی تعداد کے تناسب، اور اپنی اقتصادی خستہ حالی اور سیاسی پسماندگی سے بے پرواہ ہو کر، اور اپنے ملی مزاج کے مطابق نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر حصہ لیا، اور حسب توقع جلد ہی اس تحریک کے افسردہ جسم میں نیا جوش و خروش، اور نئی حرارت و تپش پیدا کر دی، اس وقت اس تحریک کی قیادت یا تو علمائے دین کے ہاتھ میں تھی یا ان قائدین کے ہاتھ میں جو اپنی طرز پر سوچتے تھے، تحریک خلافت اس کی بہترین مثال ہے، ان رہنماؤں کے لئے جو جذبہ سب سے زیادہ محرک و طاقتور تھا، اور جو ان کو تدریس کے حلقوں اور خانقاہوں کے حجروں سے باہر لایا تھا، وہ یہ تھا کہ اس ملک کی آزادی کے بعد ان کو اپنی دینی و ذہنی امنگوں کی تکمیل کا موقع ملے گا، اور ایک آزاد ملک میں ان کو اپنی آئندہ نسلوں کو اپنے عقیدہ، اپنے مسلک زندگی، اور اپنے پسندیدہ طریقہ کے مطابق ڈھالنے اور پروان چڑھانے کی آزادی میسر ہوگی، جن اداروں کو انھوں نے سینہ سے لگا لگا کر اور دامن میں چھپا چھپا کر ابھی تک قائم رکھا ہے، اور جنھوں نے آزادی کی اس جنگ میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے، ان کو اب وہ

فخر و اعتماد کے ساتھ قائم بھی رکھ سکیں گے، اور ترقی بھی دے سکیں گے، اور ایک آزاد و باعزت قوم کی طرح جو اس ملک کے تمام دستوری سہولتوں اور آزادیوں کی مستحق ہے، اپنی پسند اور اپنی ضرورت کے تعلیمی مرکز قائم کر سکیں گے اس لئے کہ ان مسلمان سیاسی رہنماؤں، اور تحریک آزادی کے سپاہیوں اور رضا کاروں کے عقیدہ میں بھی آزادی کا اصل مفہوم اور غلامی کے دور کے خاتمہ کی علامت تھی، اور زندگی کی حقیقی لذت و عزت تھی، مجھے اس بارے میں ذرا بھی تردد نہیں، کہ اگر آزادی کی جد وجہد کے آغاز میں مسلمانوں کو اس بارے میں ذرا بھی شبہہ ہو جاتا، کہ ان کو اپنی جائز اور فطری امنگوں کی تکمیل کا موقعہ نہیں ملے گا، اور ان کو اپنے دینی و اعتقادی لسانی و ثقافتی، اور تہذیبی و معاشرتی تسلسل کو برقرار رکھنے میں وہ سہولت بھی حاصل نہ ہوگی، جو انگریزوں کے دور غلامی میں حاصل تھی، تو ان کے جذبات افسردہ، ان کے حوصلے پست، اور ان کے دست و بازو شل ہو جاتے اس لئے کہ جہاں تک مسلمان کا تعلق ہے اس کے نزدیک دینی آزادی، تہذیب و معاشرت کے تحفظ، اور ان سرچشموں کی بقاء کے بغیر جن سے مسلمان نسل کی اجتماعی شخصیت شادابی حاصل کرتی ہے، کوئی معنی نہیں رکھتی، جن لوگوں نے جاہلیت اور اسلام کے فرق، ہجرت کے احکام و مسائل اور اس کے موجبات و محرکات، اسلام میں علم کی فرضیت، اور اس کے تقدس کے درجہ پر ذرا بھی غور کیا ہے، وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں، کہ کسی ماحول کے آزاد و غیر آزاد ہونے، اور کسی ملک میں مسلمانوں کے باعزت اور اسلامی طریقہ پر رہنے کا کیا معیار ہے،

لیکن حصول آزادی اور تقسیم ملک کے بعد وہ حالات پیش آئے، جو کم سے کم

تحریک آزادی کے مسلمان قائدین، اور سیاسی رہنماؤں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھے، میری مراد یہاں کشت و خون، اور ان فسادات سے نہیں ہے، جن کو حکومت و صحافت کی زبان میں فرقہ وارانہ فسادات سے موسوم کیا جاتا ہے، کہ یہ ایک مریض معاشرہ کی سرسامی کیفیت ہے، جس میں زیادہ دن باقی رہنے کی صلاحیت نہیں، اور کوئی جمہوری ملک بھی اس کو زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتا، اصل مسئلہ جان کا نہیں، ایمان کا ہے، جو مسلمان کو زیادہ عزیز ہے، اس ایمان کے تحفظ اور تسلسل کے لئے موہوم نہیں، فرضی اور مبالغہ آمیز نہیں، حقیقی اور سنجیدہ خطرات پیدا ہو گئے ہیں، بہت سے مذاہب کے برخلاف اسلام ایک سوچے سمجھے عقیدہ، ایک فیصلہ و ارادہ کے ساتھ اختیار کئے ہوئے طریقۂ زندگی، تسلیم و قبول کئے ہوئے چند حقائق، ذات و صفات الٰہی کی اجمالی سہی لیکن پیغمبروں کی تعلیم، اور بالخصوص خدا کے آخری پیغمبر کی تلقین کے مطابق علم و معرفت، توحید، رسالت و آخرت کی خالص اسلامی عقیدہ پر ایمان لائے بغیر نہ وجود میں آ سکتا ہے، نہ باقی رہ سکتا ہے، اس بنا پر مسلمان کے لئے سب سے زیادہ جس بات کا اطمینان حاصل کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ کیا اس کے اور اس کی آئندہ نسلوں کے لئے وہ ماحول باقی رہے گا، جس میں وہ اس عقیدہ کے مطابق زندگی گذار سکے، اور اس کو اپنی آئندہ نسل تک منتقل کر سکے؟ قرآن مجید میں کئی جگہ یہ مضمون بیان کیا گیا ہے، کہ خدا کے پیغمبروں نے دنیا سے جانے سے پہلے اس کا انتظام بھی کیا، کہ ان کی اولاد ان کی دعوت و مسلک پر قائم رہ سکے، اور اس کے لئے انھوں نے بڑے سے بڑا اہتمام جو اس دنیا میں ممکن ہے اس سے دریغ نہیں کیا، حضرت ابراہیم جو اس ملت کے مورث اعلیٰ ہیں، ملة ابيكم ابراهيم

کا واقعہ اس بارے میں ہر مسلمان کے لئے مشعل راہ ہے، انھوں نے اس مقصد کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں کیں، کیسے دوررس انتظامات کئے، کس طرح خانہ خدا اور ایک خالص ایمانی فضا کی داغ بیل ڈالی اور کس طرح اپنے کنبے کے لئے شرک و اصنام پرستی کے ہر خطرہ کو دور کیا، اور اس کے ہر روزن کو مسدود :-

رب انهن اضللن كثيرا من الناس — اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کر دیا ہے پھر جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہی ہے

فمن تبعني فانه مني ومن عصاني — اور جو شخص میرا کہنا نہ مانے سو آپ تو کثیر المغفرہ

فانك غفور رحيم ٥ — اور کثیر الرحمہ ہیں۔

کا نعرہ بلند کیا، کس طرح ان کو اپنا مقصد زندگی، اور مرکز زندگی یاد دلانے کے لئے سب آستانوں سے اٹھا کر ایک آستانہ پر ڈال دیا :-

ربنا اني اسكنت من ذريتي بواد غير ذي — اے ہمارے رب میں اپنی اولاد کو آپ کے معظم گھر کے قریب ایک میدان میں جو زراعت کے قابل نہیں آباد کرتا ہوں

زرع عند بيتك المحرم ٥ ربنا ليقيموا الصلوٰة ٥ (ابراہیم) — اے ہمارے رب تا کہ وہ نماز قائم کریں۔

پھر اس سب کے بعد بھی ان کو اطمینان نہیں ہوتا، اور دم واپسیں کے وقت کہ جب آدمی کو کچھ یاد نہیں رہتا، ان کو یہی لو لگی ہے کہ وہ اسی دین پر قائم رہیں، اور اسی پر جئیں اور مریں۔

ووصى بها ابراهيم بنيه ويعقوب يا بني ان الله اصطفى لكم الدين فلا تموتن الا وانتم مسلمون ٥ (بقرہ ۱۳۲) — اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بیٹا خدا نے تمہارے لئے یہی دین پسند فرمایا ہے تو مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔

اور یہی ان کے خاندان کا شعار رہا،

وجعلها كلمة باقية في عقبه لعلهم يرجعون (زخرف ۲۵) — اور وہ اس عقیدہ کو اپنی اولاد میں بھی ایک قائم رہنے والی بات کر گئے تا کہ ہر زمانہ میں مشرک سے لوگ باز آتے رہیں۔

چنانچہ ان کے پوتے حضرت یعقوب نے بھی دنیا سے رخصت ہوتے وقت اپنے سارے کنبہ کو جمع کیا اور اس بات کا اطمینان حاصل کیا، کہ وہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان کے دین و مسلک پر قائم رہیں گے،

ام كنتم شهداء اذ حضر يعقوب الموت — کیا تم موجود تھے جس وقت یعقوب کا آخری وقت آیا اور

اذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدي (بقرہ) — جس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ تم لوگ میرے بعد کس چیز کی پرستش کروگے۔

پھر خدا کے آخری پیغمبر نے جو ان سب کا وارث تھا، اس پر آخری مہر لگا دی، اور دنیا کے ہر حصہ میں بسنے والے مسلمانوں، اور قیامت تک پیدا ہونے والے کلمہ گو انسانوں سے قرآن مجید کے معجزانہ الفاظ میں صاف طریقہ پر کہہ دیا کہ

ان الدين عند الله الاسلام — (معتبر دین اللہ کے یہاں اسلام ہی ہے)

اور معتبر زندگی اللہ کے یہاں مسلمانہ ہے، اس لئے فکر و اہتمام کی چیز یہ نہیں ہے کہ معاشی ضروریات کس طرح مہیا ہوئیں، فکر و اہتمام کی چیز یہ ہے کہ جب مسلمان اٹھے دنیا سے جائے، تو یہ دیکھا جائے کہ وہ خدا کا فرمانبردار اور مسلم بن کر دنیا سے گیا، اور ایمان سلامت لے گیا،

ولا تموتن الا وانتم مسلمون — اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

اور اصل کامیابی یہی ہے :-

فمن زحزح عن النار وادخل الجنة فقد فاز — پس جو بچا دیا گیا آگ سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہے۔ اور نہیں دنیا کی زندگی مگر

وما الحيوٰة الدنيا الا متاع الغرور — دھوکے کا سامان

انگریزوں کے دور غلامی میں نہ ریاست کے تصور اور مفہوم نے اتنی ترقی کی تھی، نہ حکومت کا دائرہ عمل اور دائرہ اختیار اتنا وسیع ہوا تھا، اور نہ ان کے

(غیر ملکی اور الگ نسل و قوم کے حاکم ہونے کی بناء پر) سیاسی مصالح کا تقاضہ تھا کہ وہ شہریوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں دخل دیں، اور اس کو اپنے انتظام اور تولیت میں لے لیں، اور کوئی شعبہ حکومت کے دائرہ اختیار سے خارج نہ رہے، اس ملک کی تعلیمی پسماندگی کی بناء پر، اور اس سیکولرزم کے تقاضہ سے جس کا انھوں نے اعلان کم عمل زیادہ کیا، اور ہمیں ایک منصف اور بے لاگ مورخ کی حیثیت سے اس کا اعتراف کرنا چاہیئے، انھوں نے اس ملک کے مختلف فرقوں کو اپنی تعلیم کا انتظام کرنے، اور اپنے پسند کے مکاتب و مدارس قائم کرنے کی بہت بڑی حد تک آزادی دی، یہاں کے اعتقادی اور تہذیبی اختلاف و تنوع کا بھی تقاضا تھا، اور ان کی وہ حکمت عملی بھی تھی جس میں وہ مغربی استعمار پسند قوموں میں بھی فائق ثابت ہوئے۔ بہر حال اس کو ان کی کمزوری کہیئے، یا ان کی سیاسی ذہانت کہ ان کے دور میں کم سے کم مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ، اور ان کی آئندہ نسلوں کا مستقبل ایسا سنگین مسئلہ نہیں بنا تھا، جیسا مختلف تاریخی اور سیاسی عوامل و اسباب کی بناء پر اس وقت بن گیا ہے، اور اب مسلمانوں کے لئے اس انتہائی سنجیدگی، حقیقت پسندی، اور عزم و ہمت کے ساتھ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا وقت آگیا ہے، کہ وہ اپنے اس اعتقادی اور تہذیبی تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے اپنی آئندہ نسلوں کا دینی مستقبل محفوظ رکھنے کے لئے اور مختصر الفاظ میں اسلام کو اس ملک میں باقی رکھنے کے لئے کیا کریں؟ قوموں اور ملتوں کی زندگی میں ایسے موڑ صدیوں کے بعد آتے ہیں، لیکن ان کے اثرات بھی صدیوں اور ہزاروں برس تک قائم رہتے ہیں، ایک عاجلانہ فیصلہ، ایک ذرا سی کم ہمتی، ایک خفیف سا تذبذب، ایک ہلکی سی بے ضمیری، ایک معصومانہ فریب

خوردگی، ہزاروں برس تک کے لئے بڑی بڑی جری اور ذہین قوموں کی قسمتوں پر مہر لگا دیتی ہے، خود اس ملک کی قدیم نسلوں اور قوموں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے اور دنیا کے ہر خطہ میں اس کی مثالیں موجود ہیں، ؏

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

حضرات!

مسائل و مشکلات کی نہ تعداد مقرر ہے، نہ نوعیت معین، کوئی بڑے سے بڑا مبصر اور مورخ بھی نہ ان کی تعداد بیان کر سکتا ہے نہ اقسام معین کر سکتا ہے لیکن ایک شاہ کلید ہوتی ہے، یا ایک جادو کی چھڑی جو سارے قفلوں کو کھول سکتی ہے، اور ساری رکاوٹوں کو دور کر سکتی ہے، اس کے لئے زمان و مکان کی بھی قید نہیں، اور اسباب و وسائل کی بھی شرط نہیں، وہ شاہ کلید جس سے ہر قفل کھل سکتا ہے، وہ ہے ملی عزت، اور اجتماعی فیصلہ، اگر اس ملک کے مسلمان یہ فیصلہ کر لیں کہ ان کو اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل کا تحفظ اور ان کی تعلیم کے مسئلہ کا حل اس ملک کے ہر مسئلہ ہر مفاد، ہر سہولت، ہر عزت، ہر خوش حالی، اور ہر کامیابی سے زیادہ عزیز ہے، تو یہ مسئلہ ایک دن میں حل ہو سکتا ہے، اس کے لئے ان کو ہر وہ قربانی دینی ہوگی، جس کی اس جمہوری ملک کے اندر اور دستور کے ماتحت گنجائش ہے، اور جو اس ملک کے حقیقت پسندوں پر، اور دنیا کے دوسرے ممالک پر ثابت کر دے کہ مسلمانوں کو اپنا دین و ایمان، اور اپنی اولاد کا اسلام پر قائم رہنا ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے، اور اس کے بغیر وہ اس ملک کے جمہوری ڈھانچہ میں، اس کے چھوٹے سے چھوٹے نمائندہ ادارہ سے لے کر ملک کے

سب سے بڑے انتخابی نمایندہ مجلس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، وہ یہاں کوئی ذمہ داری کا منصب قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، وہ کوئی ایسا کام کرنے کے لئے تیار نہیں، جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہو کہ ان کے سب مسائل حل ہو گئے ہیں، اور وہ ایک مطمئن اور آزاد شہری کی طرح زندگی گذار رہے ہیں، یہ کام بغیر کسی تخریب، کسی جارحانہ اقدام، کسی معاندانہ ذہنیت، کسی حریفانہ کشمکش، کسی شرپسندی اور انتشار کے بغیر ہو سکتا ہے، لیکن اس کے لئے ذاتی مفادات، ذاتی جذبات، اور ذاتی وابستگیوں کی قربانی کی ضرورت ہوگی، اس قربانی کے بغیر کسی چھوٹی سی چھوٹی قوم کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ شعار، اس کی کوئی چھوٹی سی چھوٹی نشانی اور حقیر سے حقیر مفاد بھی محفوظ نہیں رہتا، ایک ملت کا مستقبل اور اس کی شہ رگ اس کی درید حیات کیسے محفوظ رہ سکتی ہے، دس برس سے دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارموں سے مختلف پیرایہ بیان میں اس مسئلہ کو پیش کیا جا رہا ہے، خود اس عاجز نے سالانہ کانفرنس کے خطبہ صدارت میں اس مسئلہ کو منطق واستدلال کے امکانی قوت کے ساتھ، اور عقل سلیم کو متاثر کرنے والی ہر دلیل کے ساتھ پیش کیا ہے، کسی ملک کے مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ پر شائد اتنا محکم ومدلل لٹریچر اس تھوڑے عرصہ میں تیار ہوا ہو، جتنا کہ اس دس برس کے عرصہ میں دینی تعلیمی کونسل نے پیش کیا، لیکن مسئلہ تقریباً وہیں ہے جہاں تھا، اب اس کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ ہے ملی غیرت، اور اجتماعی فیصلہ اور میں اسی کو درد کی آخری دوا سمجھتا ہوں، اور اسی پر ختم کرتا ہوں، ع

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا